اقبال کا تصورِ حیات بعد الممات: قرآن کی روشنی میں

[1]ڈاکٹر محمد امجد عابد [2] ڈاکٹر محمد سلمان بھٹی [3] عظمیٰ یٰسین [4] عاطف منظور

Iqbal's concept of life after death: In the light of The Holy Qura

Abstract: The focus of this article is to critically evaluate the concept of death in the philosophy of Allama Muhammad Iqbal in the light of The Holy Quran. Allama Muhammad Iqbal believes that it is a process of transmigration in the true sense of answerable to Allah Almighty for the deeds up to the day of judgement. Basically Allam Muhammad Iqbal is of the view that the process of transmigration is destined towerds eternity with denying immortality of this word. In this article it has been concluded that Allama Muhammad Iqbal has firm belief in teachings of Islam and concept of The Holy Quran regarding death.

Keywords: Allama Iqbal, Life, Death, Day of reckoning, Spirit, Creation, Innihilation, Survival‹, Eternety

کلیدی الفاظ: علامہ اقبال، زندگی، موت، یوم حساب، روح، تخلیق، فنا، بقا، عبدیت

اقبال کا نظریہ اس بات کی نفی کرتا ہے کہ انسان گوشت پوست کی تجسیم ہے اوراسے ایک ایسے پیکر کے مترادف قرار دیتا ہے جس کی فطرت ممکنات زندگی کی امین ہے جو اللہ تعالیٰ کا دستِ قدرت ہے اور جس کی نگاہ کے آگے سر کلیم و خلیل کی تمام حقیقتیں واشگاف ہیں۔ ہر چند اقبال پر زندگی کی جملہ کثافتوں کی حقیقت واضح ہے اور وہ فرد کو ان سے فرار کی تعلیم نہیں دیتا۔ لیکن یہاں اس

حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ وہ زندگی کے انبوہ میں فرد کو گم ہو جانے یا ایک معمول کے مطابق زندگی گزارنے کی تلقین بھی نہیں کرتا۔ اقبال کے فلسفۂ زندگی کا ماخذ قوتِ تسخیر ہے۔ اسی قوت سے اقبال نے مردِ مومن کے تصور کو جنم دیا۔ اقبال کے نظریات میں خاک کی ناپائیداری تو مسلّم ہے لیکن ان کے ہاں زندگی کا جو مقصد سب سے نمایاں ہے وہ دائمی زندگی ہے۔ وہ زندگی جسے ہم حیات بعد

الممات بھی کہہ سکتے ہیں۔ حالانکہ موت ایک ایسا نقطہ ہے جہاں زندگی رک جاتی ہے۔ تاہم یہ باور کرنا بھی مناسب ہے کہ زندگی موت کی اہم ترین ثنویت اور موت کے بغیر زندگی کا تصور بھی ممکن نہیں۔ اقبال موت کو عدم یا اختتام زندگی کی بجائے بلندی کی طرف پرواز قرار دیتے ہیں اور یہی قرآنی فکر ہے کیونکہ قرآنِ حکیم نے موت کا انجام رجوع الی اللہ قرار دیا ہے یعنی بندہ پس مرگ لوٹ کر اپنے آقا کی طرف جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہے۔

انا للہ و انا الیہ رٰجعونo (البقرہ: ۱۵۶)

ترجمہ: ”بے شک ہم اللہ ہی کے ہیں اور بیشک ہمیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے“

1۔ شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور

2۔ شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور

3۔ ڈویژنل پبلک سکول، ماڈل ٹاؤن، لاہور

4۔ ڈویژن آف ایجوکیشن، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور

اقبال کے نزدیک موت، مکانی کا لا مکانی کی طرف سفر ہے۔ یا فانی کا باقی کی جانب سفر ہے اور جب یہ فانی وجود اس باقی ذات کی آغوش محبت میں پہنچتا ہے تو اس پر موت حرام ہو جاتی ہے یہ بالکل ایسے ہے کہ قطرہ سمندر میں چلا گیا اور زندہ جاوید ہو گیا۔

یہاں بھی جان پاک سے حقیقت انسان مراد ہے جو موت سے پاک ہے اور موت اس کے مقدس سفر کا نام ہے جو غیب الغیب کی طرف جاتا ہے اور جب انسان موت کا ذائقہ چکھنے کے بعد حسن ازلی کے جلووں سے سر فراز ہوتا ہے اس بے سود اور بے جہت ذات کے حسن کی تجلیات کا نظارہ کرتا ہے۔ متکلم از کے خوبصورت کلام سے مسرور ہوتا ہے تو موت کی حقیقت سے پردے خود بخود اُٹھ جاتے ہیں اور پھر ہر طرف یہ صدا سنائی دیتی ہے کہ اگر یہ موت ہے جس کے بعد خالق حقیقی کا قرب حاصل ہوتا ہے تو ایسی موت تو بار بار آنی چاہیے۔

اقبال کہتے ہیں کہ موت ایک نئی زندگی کا پیغام لاتی ہے۔ بہت خوش نصیب ہے وہ شخص جو موت کی حقیقت سے آگاہ ہے۔ اب سوچنے اور سمجھنے کی بات یہ ہے کہ وہ نئی زندگی کیا ہے؟ کیسی ہے؟ کیا سب کی زندگی ایک سی ہو گی؟

اقبال ایک فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک باعمل مسلمان بھی تھے جہاں وہ فلسفیانہ انداز میں غور و فکر کرتے تھے وہاں قرآن ان کے لیے مشعلِ راہ تھا۔ اس لیے اسلام کے بنیادی عقائد میں یہ ایک اہم عقیدہ ہے کہ انسان کے مرنے کے بعد ایک دوسری زندگی شروع ہو گی جس میں اس کو اپنے اچھے اور بُرے اعمال کی جزا و سزا ملے گی۔ محدثین اور اشاعرہ اس کو جسمانی زندگی قرار دیتے ہیں اور اس جزا و سزا کو مادی سمجھتے ہیں۔ لیکن حکمائے اسلام نے اس کو روحانی زندگی قرار دیا ہے۔ چونکہ اس روحانی زندگی کا تخیل عام لوگوں کی فہم سے بالاتر ہے اس لیے اس کو مادی طریقوں سے بیان کیا گیا ہے لیکن اقبال نے ان دونوں کے درمیان ایک ایسی بہترین تطبیق دی ہے جس کے مطابق آخرت کی یہ زندگی جسمانی بھی ہو گی اور روحانی بھی۔

اسلام انسان کو ایک زندہ شخصیت تصور کرتا ہے اور یہ تصور قرآن میں نہ صرف اسی ارضی زندگی کے لیے استعمال ہوتا ہے، بلکہ حشر، بعد الموت کے لیے بھی قائم رہتا ہے چنانچہ حیات بعد الممات میں انسان کے لیے جزا و سزا مقرر ہے۔ اسلامی، فلسفے میں حیات بعد الممات ایک مسلم اصول رہا ہے اس لیے کہ اسلامی فکر خودی کے لا محدود امکانوں اور روحانی آزادی کی علمبردار رہی ہے۔ ہم مرنے کے بعد اس منزل سے اپنا سفر شروع کرتے ہیں جس منزل پر ہم نے دنیا میں اس کو چھوڑا تھا۔ ہمارے روحانی ارتقا کا تسلسل بے خلل باقی رہتا ہے جو اس دنیا میں روحانی لحاظ سے محروم رہا وہ آخرت میں بھی محروم رہے گا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

ومن کان فی ھذہٖ اعمیٰ فھوفی الاٰخرۃ اعمی و اضل سبیلا۔ (بنی اسرائیل: ۷۲)

ترجمہ: جو شخص اس دنیا میں اندھا ہو گا (معنوی اعتبار سے) تو وہ آخرت میں زیادہ اندھا اور زیادہ گمراہ ہو گا"

جسمانی طور پر اندھا ہونا بڑی محرومی ہے اور معنوی لحاظ سے اگر کوئی اندھا ہے تو اس کی محرومی کی انتہا نہیں۔ وہ نہ صرف محروم ہو گا بلکہ پابند بھی ہو گا۔ روح کی آزادی سے وہ کبھی آشنا نہیں ہو سکتا۔ جن کو زندگی میں یہ آزادی نصیب تھی وہ موت کے بعد بھی آزاد رہیں گے اور اپنے وجود کے تسلسل کو برقرار رکھ سکیں گے۔ جسم کی موت حقیقت میں موت نہیں بلکہ ایک نئی زندگی میں قدم رکھنا ہے۔ اس لیے موت سے ڈرنا کیا؟ بقول یوسف حسین: اقبال کے نزدیک موت صید ہے جس کی تاک میں انسان کو بیٹھنا چاہیے تاکہ ہستی کا ارتقاء رکنے نہ پائے۔ ا دین اسلام زندگی کو پیہم انقلاب اور مسلسل ارتقا سے ہم کنار کرتا ہے۔ یہ ارتقا در حقیقت معرفتِ الٰہی سے عبارت ہے جس کا حق انسان سے کسی بھی مرحلے پر ادا نہیں ہو سکتا۔ اقبال کے نزدیک چونکہ حقیقت مطلق لامتناہی ہے۔ لہٰذا معرفتِ حق کا سلسلہ بھی لامتناہی ہے۔ اس طرح زندگی، موت کے بعد بھی معرفتِ الٰہی کی راہ میں کوشاں رہتی ہے اور موت اس پر اثر انداز نہیں ہوتی، حتیٰ کہ عالم برزخ میں بھی یہی کیفیت برقرار رہتی ہے۔

لحد میں بھی یہی غیب و حضور رہتا ہے

اگر ہو زندہ تو دل نا صبور رہتا ہے

فرشتہ موت کا چھو تا ہے گو بدن تیرا
تیرے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے ۲

اصطلاحاً موت سے لے کر قیامت تک کے وقفے کو عالم برزخ کہا گیا ہے:

"برزخ کا لفظی معنی ہے کوئی چیز جو دو چیزوں کے درمیان حائل ہو تی ہو۔ اصطلاحاً اس کا مطلب موت اور دوبارہ زندہ ہو نے کی درمیانی حالت یا عرصہ ہے۔ اسے عالمِ بر زخ یا عالمِ ارواح کا نام بھی دیا جا تا ہے۔"۳

قرآن مجید میں حیات بعد الممات کے لیے آخرت کا لفظ استعمال ہوا ہے جو بالکل نئی طرح کی زندگی ہو گی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

و اللہ انبتکم من الارض نباتاo ثم یعیدکم فیھا و یخرجکم اخراجا o(النوح: ۱۸،۱۷)

ترجمہ: اور اللہ نے تمہیں زمین سے سبزہ کے طور پر اگایا پھر تمہیں اس میں لو ٹا دےگا اور تمہیں

ایک نئی پیدائش میں نکال کھڑا کرے گا۔"

حیات بعد الممات یا آخرت پر ایمان اسلام کا پانچواں اصول ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان کے بعد جب تک موت کے بعد زندگی پر ایمان نہ لایا جائے یہ مکمل نہیں ہو تا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

الٰھکم الہ واحد، فالذین لا یؤمنون بالاٰخرۃ قلوبھم منکرۃ و ھم مستکبرونo (النحل: ۲۲)

ترجمہ:"تمہارا معبود ایک ہی ہے۔ سو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لا ئے ان کے دل انکاری ہیں اور وہ تکبر کر تے ہیں"

آخرت کا مفہوم یہ ہے کہ کسی بھی خاتمے یا انجام کے بعد جس عمل کا آغاز ہو، اسے آخرت کہا جائے گا۔ گویا عالم آخرت وجود رکھتا ہے، جو ہمارے موجودہ عالم دنیا کے خاتمے کے بعد شروع ہو گا۔ موت سے لے کر قیامت تک کے وقفے کو عالم برزخ اور قیامت سے لے کر ابد الاباد تک کے دور کو حشر کہا جاتا ہے۔ جس میں تمام مخلوقات کا حساب کتاب ہو کر اعمال کے مطابق جزاو سزا مل جائے گی اور پھر آخرت کا دور شروع ہو گا، جس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہنا ہے، گویا آخرت وہ ہمیشہ کی زندگی ہے، جو دنیا میں کیے گئے اعمال کے بدلے میں ملے گی۔ وہی ہماری اصل زندگی ہے۔ وہی اصل مقام ہے۔ ہم اسی کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ اس دنیا میں انسان وہیں جانے کی تیاری کر تا ہے۔ دین اسلام کا حکم ہے کہ یہ تیاری اللہ کی اطاعت اور متابعت میں اور اس کی دنیا کو پر امن بنا کر ہونی چاہیے۔ دنیا میں انسان کے اعمال ہی اسے آخرت کے لیے تیار کرتے ہیں۔ جہاں اسے اعمال حسنہ کا اجر ملے گا۔

اقبال کے لیے یہ بات نا قابلِ فہم ہے کہ موت سے حق و باطل اور خیر و شر اور کر دہ و نا کر دہ سب نیست ہو کر یکساں ہو جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک فکر و نظر، ذوق و شوق اور وجدان و شعور کا جسمانی فنا کے ساتھ ضائع ہو جانا امر محال ہے۔

اقبال انسانی بقا پر ایمان رکھتے ہیں اور موت کو مسکرا کر لبیک کہتے ہیں۔ یہی جر أت ان کے نزدیک مسلمان ہونے کی علامت ہے۔ بقائے روح اور حیات بعد الممات کا مسئلہ بہت اہم ہے۔ کیوں کہ اس کا اثر ہماری زندگی پر بہت زیادہ ہو تا ہے۔ اس مسئلے کی بحث میں کئی اور مسائل ہمارے سامنے آتے ہیں۔ جن کا اس مسئلہ اور ہماری زندگی سے براہِ راست تعلق ہے۔ مثلاً روح کیا ہے؟ اسکا جسم اور خدا سے کیا تعلق ہے؟ کیا وہ جسم کے بغیر قائم اور موجود رہ سکتی ہے؟ اگر نہیں تو جسمانی موت کے بعد اس کا وجود کس طرح

ممکن ہے اور کس صورت میں ممکن ہے؟ کیا روح مختلف اجسام میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ جسمانی موت کے بعد وہ کہاں جاتی ہے۔ اس قسم کے بہت سے مسائل ہیں جو حیات بعد الممات کے مسئلہ سے متعلق ہیں۔ غرض یہ مسئلہ مشکل بھی ہے اور اہم بھی اور مفکرین نے اس پر کافی غور و خوض کیا ہے۔ حیات بعد الممات کا مسئلہ نظری بھی ہے اور عملی بھی۔ جہاں تک عملی ہونے کا تعلق ہے تقریباً تمام مذاہب میں اس کے متعلق کچھ نہ کچھ کہا گیا ہے۔ نظری پہلو پر مفکرین نے بحث کی ہے۔ یہ بحث مابعد الطبیعیاتی اور اخلاقی دونوں لحاظ سے کی گئی ہے۔ بقول سعید احمد:

> ”قدیم مفکرین افلا طون اور فلا طینوس انفرادی روح کی بقا کے قائل تھے اور ارسطو روح کل کی بقا کا۔ مسلم مفکرین فا رابی اور ابن رشد، ارسطو کی پیروی میں صرف روحِ کل کی بقا کے قائل ہیں اور نہ حیات بعد الموت کے۔ ہو بز، ہیوم، گوئٹے، نطشے، ڈیوی، روح اور حیات بعد الموت دونوں کے منکر ہیں۔ بیکن، لاک، برکلے، لوئزے، ولیم جیمز، روح اور حیات بعد الموت کو صرف عقیدہ کے طور پر مانتے ہیں۔ اسینوز اور شو پنہار انفرادی روح کی بقا کے قائل نہیں بلکہ صرف ”روح کل“ کو ابدی مانتے ہیں۔ بر گساں حیات کو ازلی و ابدی مانتا ہے لیکن انفرادی زندگی نہیں بلکہ حیاتِ مطلق کو۔ کانٹ اور اس کی پیروی میں فشٹے اور سجوک اخلا قی بنیاد پر روح کی ابدیت کے قائل ہیں۔“۴

حیات بعد الموت اور روح کی بقا کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کے جوہر یعنی روح کا تجزیہ کیا جائے۔ اخلاقیات اور مذہب میں ہم جن چیزوں کو شر اور خیر کہتے ہیں، انھیں سمجھنے کے بعد ہی ہم روح کو سمجھ سکتے ہیں۔ دین میں روح کی دو قسمیں بتائی گئی ہیں۔

ا۔ روح حیوانی

۲۔ روح الٰہی

قرآن پاک میں روح حیوانی کے لیے ”نفس“ کا لفظ استعمال ہوا ہے، جو لالچ، تحریص اور بدی کے آگے جھک جاتا ہے، جب اسے موت آجاتی ہے تو ”روح الٰہی“ زندہ رہتی ہے یہی روح آخرت کا توشہ ہے، جو خیر کو برقرار رکھتی ہے اور بدی کی مزاحمت کرتی ہے، انسانی نفس اس دنیا میں تین حالتوں سے گزرتا ہے۔

ا۔ امارہ (باغی اور نافرمان)

۲۔ لوامہ (خود کو مجرم اور گنہگار سمجھنا)

۳۔ مطمئنہ (پاک اور اللہ کی رضا پر چلنا)

> ”جب نفس آخری حالت یعنی نفس مطمئنہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے تو گویا وہ روح الٰہی سے مل جا تا ہے اور یوں روح الٰہی آخرت کے لیے پورے طور پر تیار ہو جا تی ہے۔“۵

موت کے بعد روح اس مرحلے پر پہنچ جاتی ہے جس کے بارے میں قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے۔

و قیل للذین اتقو ا ما انزل ربکم قا لو خیرا للذین احسنو ا فی ھذہِ الدنیا حسنۃ و لدار الا خرۃ خیر و لنعم دار المتقین ٥

(النحل: ۳۰)

ترجمہ: ”اور جو تقوی اختیار کر تے ہیں، انہیں کہا جا تا ہے تمہارے رب نے کیا اُتارا؟ کہتے ہیں بھلائی۔ جو لوگ نیکی کر تے ہیں ان کے لیے اس دنیا میں بھی بھلائی ہے اور آخرت کا گھر یقینا بہتر ہے اور متقیوں کا گھر بہت ہی اچھا ہے۔“

جہاں تک روح کل کی بقا کا تعلق ہے اقبال اس نظریے کو قابلِ قبول نہیں سمجھتے وہ انفرادی روح کی ابدیت کے قائل ہیں۔ ابن رشد کے نظریہ پر تنقید کرتے ہوئے خطبہ اول میں اقبال کہتے ہیں کہ ابن رشد جس نے یونانی فلسفہ کی زبردست حمایت کی ارسطو کے زیر اثر وہ نظریہ پیش کیا جسے عقلِ فعال کی لافانی کا نظریہ کہا جاتا ہے۔ یہ نظریہ اس نقطۂ نگاہ کے بالکل خلاف ہے جو قرآن کریم انسانی انا کی وقعت و منزلت کے متعلق پیش کرتا ہے۔ اس طرح ابن رشد کی آنکھوں سے اسلام کا ایک زبردست اور نہایت اہم اصول اوجھل ہو گیا۔ اس کی وجہ سے اس نے ایک ایسے غلط فلسفۂ حیات کو فروغ دینے کی کوشش کی جس کے زیر اثر انسان نہ خود کو پہچان سکتا ہے نہ خدا کو اور نہ ہی کائنات کو۔ اقبال بقائے روح انسانی کے قائل ہیں لیکن وہ اسے نہ اخلاقی مفروضہ قرار دیتے ہیں اور نہ صرف اعتقاداً تسلیم کرتے ہیں بلکہ آزادی ارادہ کی طرح اسے بھی اعلیٰ اخلاق کا انعام تصور کرتے ہیں۔

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی
آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی[۶]

اقبال بیان کرتے ہیں کہ اگر خودی اوصافِ الٰہی سے متصف ہے تو وہ زندگی سے اس قدر بہرہ مند ہے کہ موت بھی اس کے لیے ایک مقامِ حیات ہے۔ جو فرد اپنی خودی کو اوصافِ خداوندی سے متصف کرکے جاودانی نہیں بناتا وہ موت سے ہمیشہ خوف زدہ اور لرزہ براندام رہتا ہے۔ قرآن مجید میں یہود سے کہا گیا:

فتمنو الموت ان کنتم صٰدقین ○ (البقرۃ: ۹۴)

ترجمہ: ”اگر تم سچے ہو تو موت کی آرزو کر کے دکھاؤ“

جبکہ مومن خندہ پیشانی سے موت کے روبرو ہوتا ہے اور اسے تحفہ سمجھ کر قبول کرتا ہے۔ یہی تعلیم تھی کہ جس کی بنا پر مسلمان جہاد فی سبیل اللہ کے جذبے سے سرشار رہتے تھے۔ ان کا مطلوب و مقصود راہِ حق میں شہادت تھا تاکہ رضائے الٰہی حاصل کریں۔ کیونکہ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں انسان موت سے بھی نہیں مر سکتا۔ موت سے جسمانی وجود کے متغیر ہو جانے کے بعد بھی روحانی وجود، جو انسان کا اصلی وجود ہے باقی رہ سکتا ہے بلکہ یہ امر بھی بعید نہیں کہ روح جو جسم کو حرکت میں لائے ہوئے ہے جسم سے علیحدہ ہو کر اور بھی زیادہ فعال بن جائے کیونکہ انسانی وجود میں اصل چیز روح ہے قالب نہیں۔ قالب تو روح کا مادی لباس ہے تاکہ روح مادی عالم میں اپنی مخفی صلاحیتوں کا اظہار کر سکے۔ قالب، روح کی وجہ سے وجود میں آیا ہے۔ روح قالب کی وجہ سے وجود میں نہیں آئی۔

اصل میں روح سے مراد وہ خاص جوہر ہے جو فکر و شعور، عقل و تمیز اور فیصلہ و اختیار کا حامل ہوتا ہے جس کی بدولت انسان تمام دوسری مخلوقات ارض سے ممتاز اور حاملِ خلافت ہستی بنتا ہے۔ انسان کے اندر روح پھونکی گئی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا ایک ہلکا سا پرتو ہے۔ اسی پرتو کی وجہ سے انسان زمین پر خدا کا فیصلہ اور ملائکہ سمیت تمام موجوداتِ ارضی کا مسجود قرار پایا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

و اذ قال ربک للملٰئکۃ انی خالق بشرا من صلصال من حما مسنون○ فاذا سویتہ و نفخت فیہ من روحی فقعوا لہ سٰجدین ○

(الحجر: ۲۸،۲۹)

ترجمہ: ”یاد کرو اس موقع کو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں سڑی مٹی کے سوکھے گارے سے ایک بشر پیدا کر رہا ہوں جب میں اسے

پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی روح سے کچھ پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا۔"

قرآن و حدیث کی رو سے موت محض جسم و روح کی علیحدگی کا نام ہے۔ جسم سے علیحدہ ہو جانے کے بعد روح معدوم نہیں ہو جاتی بلکہ اس پوری شخصیت کے ساتھ زندہ رہتی ہے جو دنیا کی زندگی کے تجربے اور ذہنی و اخلاقی اکتسابات سے بنی تھی۔ اقبال حیات بعد الممات پر پوری طرح یقین رکھتے تھے اسی لیے پہلے وہ طبعی طور پر ممکن ثابت کر تے ہیں۔ اُن کے ایک مضمون "حیات بعد موت کا اسلامی نظریہ اور سائنس" میں "حشر اجساد" کے اس اقتباس سے ان کا فلسفہ بڑی صراحت سے واضح ہو جاتا ہے:

"انسان کے مر کر دوبارہ زندہ ہو نے کا تصور یا نظریہ ئ حیات بعد الموت مذہب کی تعلیمات کا ایک ایسا عنصر ہے جو سب سے زیادہ حیرت انگیز بلکہ میں کہوں کہ نا قابلِ یقین راز ہے۔ مذہب عیسوی کے جو بنیادی عقیدے سب سے زیادہ حیران کن ہیں۔ ان ہی میں سے ایک یہ بھی ہے۔۔۔ سائنسی دماغ کو یہ تصور محض وا ہمہ معلوم ہو تا ہے اور اس کا جواز سائنس سے پیش کیا جا سکتا ہے لیکن زیر بحث موضوع کی روشنی میں مجھے ایسا معلوم ہو تا ہے کہ اس تصور کو ممکنات اور عقلی عقیدوں کی صف سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات خلاف عقل تو معلوم ہوتی ہے۔(اگر ہم اس تصور کی ایک انتہائی عملی شکل یہ فرض کر لیں کہ ایک انسان جو کسی خندق میں بم پھٹنے سے پاش پاش ہو کر مر چکا ہے اس کا جسم جن جوہری ذرات سے مرکب تھا وہ دوبارہ اس طرح مجتمع ہو سکتے ہیں کہ مذکورہ انسان پھر زندہ ہو جائے)لیکن جو موضوع اس وقت زیر بحث ہے اس کی روشنی میں وجود انسانی کے واحد ے یا اکائیاں ان تمام واحدوں یا اکائیوں سے جو ان کے مادی ماحول کی حیات گاہ کا کام دے چکے ہیں۔ اسی طاقت کے زیر عمل ہیں جس نے پہلے مجتمع کیا تھا تو اس میں کوئی چیز مزاحم نہیں ہو سکتی۔"[7]

اقبال اپنے اس مضمون میں قرآن پاک کی مندرجہ ذیل آیات سے یہ بات ثابت کرتے ہیں کہ انسان کو وہی ذات دوبارہ زندہ کرے گی جس نے اُسے پہلی بار زندگی عطا کی تھی۔

نحن قدرنا بینکم الموت وما نحن بمسبو قین ٥علیٰ ان نبدل امثالکم و ننشئکم فی مالا تعلمون ٥ولقد علمتم النشاۃ الاولیٰ فلو لا تذکرون٥ (الواقعہ: ۲۰۔۲۲)

ترجمہ:"ہم نے تم میں مرنا ٹھہرا دیا ہے اور ہم اس بات سے عاجز نہیں کہ تمہاری طرح اور لوگ تمہاری جگہ لے آئیں اور تم کو ایسے جہاں میں جس کو تم نہیں جانتے پیدا کر دیں اور تم نے پہلی پیدائش تو جان ہی لی ہے پھر تم سوچتے کیوں نہیں ہو"

وکا نو ا یقو لون أئذا متنا و کنا ترابا و عظاما ءَ اِنا لمبعو ثون ٥اوَاٰبآؤنا الاوّ لون ٥قل ان الاولین و الاٰخرین٥ لمجمو عون الیٰ میقات یوم معلوم ٥ (الواقعہ: ۴۷۔۵۰)

ترجمہ: "اور وہ کہا کرتے تھے کہ کیا جب ہم مر جائیں گے اور ہم مٹی بن جائیں گے اور ہڈیاں ہم پھر اُٹھا ئے جائیں گے اور ہمارے آبا ؤ و اجداد بھی؟ کہہ دیجیے وہ جو پہلے جا چکے ہیں اور بعد میں جا نے والے ہیں سب کو اکٹھا کیا جائے گا مقررہ وقت پر"۔

اولم یرو ا کیف یبدیٔ الخلق ثم یعیدہ ان ذٰلک علی اللہ یسیرoقل سیرو ا فی الارض فانظرو ا کیف بد أ الخلق ثم اللہ ینشی ء النشاۃ الاٰخرۃ ان اللہ علیٰ کل شیءٍ قدیرo (العنکبوت:۲۰،۱۹)

ترجمہ: "کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ خدا کس طرح خلقت کو پہلی بار پیدا کر تا ہے پھر کس طرح اس کو بار بار پیدا کر تا رہتا ہے۔ یہ خدا کے لیے آسان ہے کہہ دو کہ زمین میں چلو پھر و وہ دیکھو کہ اس نے کس طرح خلقت کو پہلی دفعہ پیدا کیا ہے پھر خدا ہی پچھلی پیدائش پیدا کرے گا۔ بے شک خدا ہر چیز پر قادر ہے۔"

ایحسب الانسان الّن نجمع عظامہo بلیٰ قٰدرین علیٰ ان نسوّی بنانہo

(القیٰمۃ: ۴،۳)

ترجمہ: "کیا انسان یہ خیال کر تا ہے کہ ہم اس کی بکھری ہوئی ہڈیاں اکٹھی نہیں کریں گے۔ ضرور کریں گے (اور) ہم اس بات پر قادر ہیں کہ اس کی پور پور درست کر دیں"

و قالوٓ ا اذا کنا عظاما و رفا تا أ اِنا لمبعو ثون خلقا جدیداo قل کونوا حجارۃ او حدیدا o او خلقا مما یکبر فی صدورکم فسیقولون من یعید نا قل الذی فطر کم اوّل مرۃ فسینغضون الیک رؤوسھم و یقولون متی ھو قل عسٰیٓ ان یکون قریبا o (بنی اسرآئیل: ۴۹۔۵۱)

ترجمہ ":اور کہتے ہیں کہ جب ہم (مر کر بو سیدہ /ہڈیاں اور چور چور ہو جائیں گے تو کیا از سرِ نو پیدا ہو کر اٹھیں گے کہہ دیجیے (خواہ تم) پتھر ہو جاؤ یا لو ہا۔ یا کوئی اور چیز جو تمہارے نزدیک پتھر اور لوہے سے بڑی (سخت) ہو۔ جھٹ کہیں گے کہ (بھلا ہمیں دوبارہ کون جلائے گا؟ کہہ دیجیے کہ میں نے تم کو پہلی بار پیدا کیا۔ (تعجب)سے تمہارے آگے سر ہلائیں گے اور پو چھیں گے کہ ایسا کب ہو گا۔ کہہ دیجیے کہ ایسا جلد ہو گا۔"

اس عقلی استدلال اور قرآنی اثبات کے پیش نظر یہ جان لینا چاہیے کہ ایک اور عالم بھی ہو گا جہاں مرنے کے بعد جی اٹھنا ہے۔ اس اخروی زندگی کا تعلق محض فلسفیانہ نہیں بلکہ انسان کے اخلاقی اور عملی زندگی سے ہے۔ اسے ماننے پر لازم ہے کہ انسان خود کو ایک ذمہ دار ہستی سمجھے اور جواب دہی اور انجام کے خیال سے مستقبل کی سعادت اور اجر کو حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اقبال کہتے ہیں کہ ٹھیک یہی دلیل ہے جسے جدید سائنسی تحقیق نے اختیار کیا۔

"یعنی اگر وہی وقت اور دھن، ہو جس نے پہلی بار ان جسموں کو جمع کر کے یکجا کر دیا تھا تو بعد از مرگ ایک بار پھر انہیں جسموں کی طلب کر کے انسان کی تخلیق ثانی سر انجام دی جا سکتی ہے۔"۸

اقبال طبعی طور پر حیات بعد الممات کو ممکن خیال کرتے ہیں۔ وہ اس ضمن میں مابعد الطبیعیاتی دلائل پیش نہیں کرتے ان کے خیال میں مابعد الطبیعیاتی طور پر اسے ثابت کیا ہی نہیں جاسکتا۔

"حیات بعد الموت کی حمایت میں صرف ما بعد الطبیعی دلائل سے کام نہیں چل سکتا۔ ما بعد الطبیعی دلائل سے دل کی تشفی نہیں ہو تی۔ نہ یہ کہ ان سے ہمارے دل میں اطمینان اور اعتماد کی کیفیت پید ا ہو۔"۹

آج کل مادہ پرستی کا دعوی ہے کہ ذہن یا روح محض دماغ کی فعلی حالت ہے اور موت کے بعد جب دماغ کی یہ حالت باقی نہیں رہتی تو ذہن یا روح کا وجود بھی باقی نہیں رہتا۔ اس لیے کہ بغیر جسم کے اس کے وجود کا تصور ممکن نہیں۔ بر خلاف اس کے اسلامی عقیدہ یہ ہے کہ انسانی روح مرنے کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ ماہرین نفسیات اس پر متفق نہیں ہیں کہ شعور کا تعلق صرف دماغ سے ہے۔ برقی رو کی توانائی (انرجی) بظاہر موصل (کنڈکٹر) میں ہوتی ہے۔ لیکن فی الحقیقت اس میں نہیں ہوتی بلکہ چاروں طرف کی فضا میں ہوتی ہے۔ اسی طرح روح کا وجود بقائے جسم سے کلیۃً وابستہ نہیں ہو سکتا۔ اقبال نے اس نکتے کو انتہائی خوبصورتی سے بیان کیا ہے:

یہ نکتہ میں نے سیکھا بو الحسن سے
کہ جاں مر تی نہیں مرگ بدن سے
چمک سورج میں کیا با قی رہے گی
اگر بیزار ہو اپنی کرن سے۱۰

اسلام میں انسانی انجام کی جو توجیہہ پیش کی گئی ہے وہ حیاتیاتی بھی ہے اور اخلاقی بھی۔ حیاتیاتی اس معنی میں کہ قرآن پاک میں برزخ کا ذکر ہے جو موت اور قیامت کے درمیان ایک وقفہ ہے۔ اقبال کے نزدیک قیامت کا اسلامی تصور مسیحی تصور سے مختلف ہے۔ اسلام میں حیات نظام تکوینی کا ایک عالم گیر مظہر ہے۔ جس کا اطلاق نہ صرف انسانوں پر ہو تا ہے بلکہ فطرت کی تمام ذی روح ہستیوں پر بھی ہو تا ہے۔ انسانی روح (انا) کی زمانے میں ابتدا ہوئی اور زمان و مکان کے نظام طبیعی میں ظاہر ہونے سے قبل اس کا وجود نہیں تھا، پھر مرنے کے بد روح کا عالم طبیعی میں دوبارہ آنا ممکن نہیں۔ جیسا کہ عقیدہ تناسخ کے ماننے والے کہتے ہیں۔ در اصل انسان کا محدود ہونا اس کی نجات کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ انسان اپنی انفرادی حیثیت سے خالق کائنات کے آگے جواب دہ ہو گا۔ کوئی دوسرا اس کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

اب سوال یہ پیدا ہو تا ہے کہ اس عالمِ فانی سے چلے جانے کے بعد عالم آخرت کے سفر میں روح کی منزلیں کتنی ہیں۔ اقبال پہلی منزل برزخ بتاتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جو دنیا و آخرت کے درمیان میں ہے۔ قرآن مجید میں برزخ کا لفظ تین بار آیا ہے لیکن اس مقامِ خاص کے معنی میں نہیں آیا۔ البتہ علیین اور سجین کے نام سے دو مقامات کا ذکر آیا ہے جن میں ارواح طیبہ و خبیثہ حشر تک مقیم رہیں گی۔

اقبال نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں روح کی طہارت اور فضیلت کو فوقیت دی ہے اور اس کے دنیاوی مسکن یعنی جسم کو روح کا بندی خانہ تصور کیا۔ اس قید خانے سے نجات کی خواہش اگر اقبال کے ہاں مجرد صورت میں ظاہر ہوتی تو شاید اس کی کوئی اہمیت نہ ہوتی۔ اقبال نے موت کے الجھے ہوئے مسئلے کو زندگی کے حوالے سے سلجھانے کی کوشش کی ہے اور اسی لیے جسم کے قید خانے سے نجات پانے کی خواہش اس کی آخری تمنا نہیں بلکہ وہ اس حقیقت کو جاننے کے لیے بے تاب ہیں جو اس ناپائیدار نقش کے مٹ جانے کے بعد آشکار ہو گی۔ اقبال زندگی کی دوامی حیثیت کو قبول کرتے ہوئے موت کو انسان کا انجام قرار نہیں دیتے بلکہ ان کے نزدیک زندگی وہ شمع سوزاں ہے جو ہمیشہ فروزاں رہتی ہے اور جسے بادِ حوادث کا شعلہ بجھا نہیں سکتا:

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں
ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں
آہ، غافل موت کا رازِ نہاں کچھ اور ہے
نقش کی ناپائیداری سے عیاں کچھ اور ہے
موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات

عام یوں اس کو نہ کر دیتا نظامِ کائنات
جوہر انسان عدم سے آشنا ہو تا نہیں
آنکھوں سے غائب تو ہو تا ہے فنا ہوتا نہیں ۱۱

اقبال کے نزدیک موت طبقاتی سطح پر انسان کا ایک انجام ضرور ہے لیکن ایک نئی زندگی کی نوید بھی ہے یوں کہا جاسکتا ہے خالقِ کائنات نے مادہ اور روح کے ادغام سے جو انسانی مجسمہ تشکیل دیا ہے۔ اقبال نے اس کے مادی پہلو کو اہم نہیں جانا بلکہ اس مدرِح حیات کو فوقیت دی ہے جس کی نگہبانی کا اسے یارا نہیں:

اس پیکر خاکی میں اک شے ہے وہ تیری
میرے لیے مشکل ہے اس شے کی نگہبانی۱۲

اقبال کے ہاں "حرکت" اور "سفر" تقاضائے حیات ہیں۔ "سکون پرستی" نہ صرف غلط بلکہ ایک مرض ہے۔ فلسفۂ اقبال میں اس کے خاص معنی ہیں۔ جب انسان اپنی انا(Ego) کو بھول جاتا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ میں جذب کر دینے کا طالب ہو تا ہے تو گویا اس کی ایک منزل قرار دیتا ہے۔ حالانکہ "روح انسانی" ہمہ وقت انسان کو اپنا وجود یاد دلاتی رہتی ہے۔ جیسا کہ اقبال نے فرمایا:

یہ عالم یہ ہنگامہ رنگ و صوت
یہ عالم کہ ہے زیرِ فرمانِ موت
یہ عالم یہ بت خانہ ئ چشم و گوش
جہاں زندگی ہے فقط خور د و نوش
خودی کی ہے یہ منزل اولیں
مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں
بڑھے جا یہ کوہ گراں توڑ کر
طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر۱۳

اسلامی عقیدے میں نجات یہ نہیں کہ انفرادی خودی گم ہو جائے بلکہ اس کی یکتائی اور استحکام میں اور اضافہ ہونا چاہیے۔ قیامت بھی ان خودیوں کے اطمینان کو متاثر نہیں کر سکے گی جنھوں نے عشق کے ذریعے گہرائی اور جوش وجہد کی کیفیت پہلے سے پیدا کرلی ہو گی۔ ذات باری کا دیدار بھی خودی اپنی ہستی کو بر قرار رکھ کر کرے گی۔

ارواح کا حشر اجساد کے ساتھ ہو گا یا بغیر اجساد کے یہ سوال بڑا اہم ہے۔ مسلمانوں کو عام طور پر عقیدہ تو یہی ہے کہ پہلے اجسام کے ساتھ ہو گا جو گل سڑ کر مٹی ہو گئے ہیں لیکن قرآن سے اس کے بارے میں مندرجہ ذیل آیات پیش کی جاسکتی ہیں جن سے یہ واضح ہو گا کہ قرآن "خلق جدید" کی بات کر تا ہے۔

بل هم فی لبس من خلق جدید۔ (قٓ: ۱۵)
ترجمہ: "بلکہ یہ لوگ خلق جدید میں شک کر تے ہیں۔"
پھر تمثیل دے کر ارشاد فرمایا:
کما بدأ نا اوّل خلق نعیده۔ (النباء: ۱۰۴)
ترجمہ: "جس طرح ہم نے پہلی پیدائش کا آغاز کیا اسی طرح ہم اس کو دوبارہ بنائیں گے۔"

اور یہ سب اس لیے کہ اعمال وافعال اور فکر وعقیدہ کی ذمہ داری سراسر روح پر ہے۔ جسم روح کے لیے صرف ایک قالب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی لیے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

علمت نفس ما قدمت و اخرتo (الانفطار: ۱۵)

ترجمہ: ”اس روز ہر نفس جان لے گا اپنے اگلے اور پچھلے اعمال کو“

ظاہر ہے کہ یہ عالم لازمانی اور لامکانی ہے اس لیے اس میں جسم سابق جو مادی تھا وہ کیسے پایا جاسکتا ہے لیکن روحِ مجرد کی انفرادیت (Individuality) کو قائم رکھنے کے لیے ایک پیکر بہر حال ضروری ہے۔ اس بنا پر اقبال حضرت شاہ ولی اللہ کی رائے نقل کرتے ہیں اور اس سے اتفاق ظاہر کرتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

”حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی جن کی ذات پر گویا الٰہیات اسلامیہ کا خاتمہ ہو گیا۔ ان کی رائے بھی یہی تھی کہ حیات بعد الموت پر ایسا کوئی مادی پیکر ناگزیر ہے۔ جو خودی کے نئے ماحول میں اس کے مناسب حال ہو، لیکن میں سمجھتا ہوں شاہ صاحب کے اس نظریہ کی حقیقی وجہ یہ ہے کہ جب ہم خودی کا تصور بطور ایک فرد کے کر تے ہیں تو ضروری ہو جا تا ہے کہ اسے کسی مقام پر اختیاری پس منظر سے نسبت دیں۔“۱۴

شاہ ولی اللہ روح کے لیے جو پیکر تجویز کرتے ہیں احادیث میں اس کا نام نسمہ ہے۔ اس کے معنی پیکر، مطیۃ الروح یعنی روح کی سواری بھی کہا گیا ہے۔ جس سے مراد یہ ہے کہ روح کو کسی بڑے لطیف پیکر روح کی ضرورت ہوتی ہے لہذا جسم انسانی فنا ہو جائے گا تو حیات بعد الموت پر اسے پھر کسی پیکر کی ضرورت ہوگی یہی پیکر نسمہ ہے۔

اسی لیے شاہ ولی اللہ اور خود علامہ اقبالؒ کی رائے بھی یہی ہے کہ حیات بعد الموت پر ایسا مادی پیکر ناگزیر ہے جو خودی کے نئے ماحول میں اس کے مناسب حال ہو۔ اقبال کے ہاں بعض جگہ یہ نکتہ بھی ملتا ہے کہ حیات بعد الموت مشروط ہے۔ صرف وہی اشخاص مرنے کے بعد باقی رہیں گے جنہوں نے اپنی خودی کو مستحکم کر لیا ہو گا۔ بقول علامہ اقبال:

”شخصی بقا ہمیں بطور حق کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کو جد و جہد سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ انسان اس کا امید وار ہو سکتا ہے۔“۱۵

اِن اشعار میں اقبال نے اسی خیال کو انتہائی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

بانِگ سرافیل ان کو زندہ کر سکتی نہیں
روح سے تھا زندگی میں بھی تہی جن کا جسد
مر کے جی اُٹھنا فقط آزاد مردوں کا ہے کام
گر چہ ہر ذی روح کی منزل ہے آغوش لحد۱۶

اقبال حیاتِ ابدی کے متعلق خطبات میں فرماتے ہیں کہ حیاتِ ابدی ہر ایک انسان کا نصیب نہیں ہو سکتی۔ یہ شرف صرف اس خودی کو حاصل ہو گا جو اپنے کردار و عمل سے خودی کو مضبوط و مستحکم کرے۔ یہ کوئی انسانی حق نہیں یہ صرف کردار سے حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ انسان کا عمل ہے جو انسان کی خودی کو تباہی کے لیے تیار کر تا ہے۔ خودی کو قائم رکھنے والے کا اصولِ عملی اپنی خودی کا احترام ہے، اور دوسرے کو خودی کا احترام بھی۔ ذاتی ابدیت ہمارا حق نہیں اسے اپنی کوشش اور عمل سے حاصل کرنا چاہیے۔ انسان اس کے لیے ایک امیدوار کی حیثیت رکھتا ہے۔

اقبال فرماتے ہیں کہ انسان کا انجام کچھ بھی ہو، لیکن اس کی اپنی انفرادیت کے ضائع ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ اس کی حالت ایسی ہو گی کہ قیامت کے دن سے پہلے عام تباہی کے باوجود اسی کی انفرادیت اس کو مکمل سکون بخشے گی۔

گویا زندگی وہ فرصت ہے جس میں خودی کو عمل کے بے انتہا مواقع میسر آتے ہیں اور جس میں موت اس کا پہلا امتحان ہے تا کہ وہ دیکھ سکے اسے اپنے اعمال و افعال کی شیرازہ بندی میں کس حد تک کامیابی ہوئی۔ اعمال کا نتیجہ نہ تو لطف ہے نہ درد، اعمال یا تو خودی کو سہارا دیتے ہیں یا اس کی ہلاکت اور تباہی کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ لہذا یہ امر کہ خودی فنا ہو جائے گی یا اس کا کوئی مستقبل ہے عمل پر موقوف ہے:

زندگانی ہے صدف، قطرۂ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے ۱۷

خودی کو برقرار رکھیں گے تو وہی اعمال جن کی بنا اس اصول پر ہے کہ ہم بلا امتیاز من و تو خودی کا احترام کریں۔ لہذا بقائے دوام انسان کا حق نہیں۔ اس کے حصول کا دارومدار ہماری مسلسل جدوجہد پر ہے۔ اقبال نے روح کی ابدیت پر شرط لگائی ہے کہ وہ خودنگر ہو تو اس کی روح قائم رہ سکتی ہے۔ خطبات میں بھی اس کی ابدیت کے خلاف یہ شرط لگائی ہے کہ یہ انسان کا حق نہیں یہ محض اچھے اور نیک عمل سے حاصل ہو سکتی ہے۔

اقبال ضرب کلیم میں روح و تن کے متعلق فرماتے ہیں کہ بدن کے ساتھ روح اس طرح منسلک ہوتی ہے، جیسے ایک انگارہ اپنی خاکستر کے ساتھ قبا پوش رہتا ہے اور عشق مدت سے پیچاک میں الجھی ہوئی ہے، کہ روح کس جوہر سے ہے اور خاک کس جوہر سے۔

عقل مدت سے ہے اس پیچاک میں اُلجھی ہوئی
روح کس جوہر سے؟ خاک تیرہ کس جوہر سے ہے؟
ارتباط حرف و معنی اختلاط جان و تن
جس طرح افگر قبا پوش اپنی خاکستر سے ہے ۱۸

ایک اور مقام پر روح کے فلسفے کو "آدم" کے عنوان کی نظم میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ وجود حضرتِ انسان نہ روح ہے اور نہ بدن، آدم ایک طلسم بود و عدم ہے اور یہ خدا کا راز ہے، جو سخن کے احاطے میں نہیں لایا جا سکتا۔

طلسم بود و عدم جس کا نام ہے آدم
خدا کا راز ہے قادر نہیں ہے جس یہ سخن
اگر نہ ہو تجھے الجھن تو کھول کر کہہ دوں
وجودِ حضرتِ انسان، نہ روح ہے، نہ بدن ۱۹

اقبال کے نزدیک موت تجدید زندگی کا نام ہے۔ جوہر انسانی عدم سے کبھی آشنا نہیں ہوتا۔ وہ کبھی فنا نہیں ہوتا محض آنکھ سے غائب ہو جاتا ہے۔

پھول بن کر اپنی تربت سے نکل آتا ہے یہ
موت سے گویا قبائے زندگی پاتا ہے یہ
موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے

خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے ۲۰

اقبال کا ابدیت کا فلسفہ در اصل اس میں مضمر ہے جو روح اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔ وہ قائم رہے گی۔ انسان محض بے یقینی سے مر جاتا ہے اگر اللہ تعالیٰ کا حکم یاد رکھیں کہ وہ روحوں کو دوبارہ زندہ کر کے اپنے حضور پیش کرے گا، تو یہ سب باتیں روشن ہو جاتی ہیں۔ دفتر عمل تو پیش ہونا ضروری ہے۔ اس لیے ابدیت یا حیات بعد الممات ضروری ہے۔

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفتر عمل

آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر۲۱

اس طرح جب روزِ محشر تمام ارواح ہوں گی تو وہی بقائے دوام حاصل کر سکیں گی جنہوں نے عمل کیا ہو گا۔ یہ اندازِ خیال قرآن کریم کی ہدایت کے مطابق ہے کہ باری تعالیٰ کی خوشنودی اُسی کو نصیب ہو گی جو کہ اعمال حسنہ کرے گا۔ جیسا کہ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے۔

واعدَّ لھم جنّٰت تجری من تحتھا الانھٰر خٰلدین فیھا ابدا ذالک الفوز العظیمo (التوبہ: ۱۰۰)

ترجمہ: ”اور ان کے لیے تیار کی ہیں جنہیں جن کے نیچے نہریں بہیں ہمیشہ ان میں رہیں، یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔“

پھر قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ فرما تے ہیں:

فاما الذین شقوا ففی النار لھم فیھا زفیر و شھیق oخٰلدین فیھا ما دامت السموت و الارض الا ما شآء ربک ان ربک فعال لما یرید oو اما الذین سعدو ا ففی الجنۃ خٰلدین فیھا ما دامت السمٰوت و الارض الا ما شآء ر بک، عطآء غیر مجذوذo (ہود: ۱۰۶۔۱۰۸)

ترجمہ:”پس جو لوگ بد بخت ہیں وہ آگ میں ہوں گے۔ ان کو وہاں چیخنا اور دھاڑنا ہے۔ اس میں رہیں گے۔ جب تک آسمان و زمین قائم ہیں مگر جو تیرا رب چاہے بے شک تیرا رب کر ڈالتا ہے جو چاہتا ہے اور جو لوگ نیک بخت ہیں تو وہ جنت میں ہوں گے، وہ اس میں رہیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں مگر جو تیرا رب چاہے۔ یہ بخشش ہو گی بے انتہا۔“

اقبال نے انفرادی سطح پر انسان اور اجتماعی سطح پر ملت کو مادی موت سے بلند ہو کر حیات جاوداں کا راز بتایا ہے اور اس زندگی جاوداں کا وسیلہ خودی کو قرار دیا ہے۔ جہاں انسان کی ابدی حیات کے راستے میں موت کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کر سکتی اور وہ زندگی کی اعلیٰ ترین رفعتوں سے ہم کنار ہو جاتا ہے روحانی ارتقا سے خودی میں یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ اپنے تجربوں کے حدود سے ماورا پہنچ جائے۔ غرض کہ زندگی اگر عالم گیر تخلیقی قوت کا مظہر ہے تو جسدی انتشار سے اس کا خاتمہ نہیں ہو سکتا اور خودی جیسی بیش بہا چیز موت کے صدمے سے تباہ و برباد نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ وہ نظام تکوینی کی جان ہے۔ اقبال کے مکمل مابعد الطبیعی تصورات کا مرکزی نقطہ خودی ہے جس کے لیے بے پایاں امکانات کی انہوں نے پردہ کشائی کی ہے۔ خودی میں صرف کائنات کی تسخیر کی صلاحیتیں ہی نہیں ہیں بلکہ اپنے سب سے بڑے مد مقابل موت پر بھی قابو پانے کی قابلیت بدرجہ اتم موجود ہے تا کہ اس کے ارتقا کی کوئی منزل آخری منزل نہ ہو۔

حوالہ جات

۱۔ڈاکٹر یوسف حسین خان، روحِ اقبال، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۴۱۳

۲۔علامہ محمد اقبال، ضربِ کلیم، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۶۵، ۶۴

۳۔عبد الرؤف، اسلامی ڈکشنری اور انسائیکلوپیڈیا، فیروز سنز، کراچی، ۲۰۰۷ء، ص ۴۵

۴۔سعید احمد، رفیق، اقبال کا نظریۂ اخلاق، مکتبہ جدید پریس، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۲۰۹، ۲۰۸

۵۔ سید قاسم، اسلامی انسائیکلوپیڈیا، الفیصل ناشران و تاجران کتب، لاہور، س۔ن، ص ۲۷
۶۔ علامہ محمد اقبال، بانگ درا، ص ۲۵۸
۷۔ علامہ محمد اقبال، علامہ اقبال تقریریں اور بیانات، مترجم: اقبال احمد صدیقی، اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۲۱۶
۸۔ علامہ محمد اقبال، علامہ اقبال تقریریں اور بیانات، ص ۲۱۷
۹۔ علامہ محمد اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، مترجم: سید نذیر نیازی، بزمِ اقبال، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۶۹
۱۰۔ علامہ محمد اقبال، بالِ جبریل، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۵۷
۱۱۔ علامہ محمد اقبال، بانگِ درا، ص ۲۳۴، ۲۳۱
۱۲۔ علامہ محمد اقبال، بالِ جبریل، ص ۹۱
۱۳۔ علامہ محمد اقبال، بالِ جبریل، ص ۱۲۸
۱۴۔ علامہ اقبال، تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، ص ۱۸۲
۱۵۔ ایضاً، ص ۱۱۲
۱۶۔ علامہ محمد اقبال، ارمغانِ حجاز، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۲۰
۱۷۔ علامہ محمد اقبال، ضربِ کلیم، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۳۱
۱۸۔ ایضاً، ص ۵۵
۱۹۔ ایضاً، ص ۵۷
۲۰۔ علامہ محمد اقبال، بانگِ درا، ص ۲۳۳
۲۱۔ علامہ محمد اقبال، بالِ جبریل، ص ۷